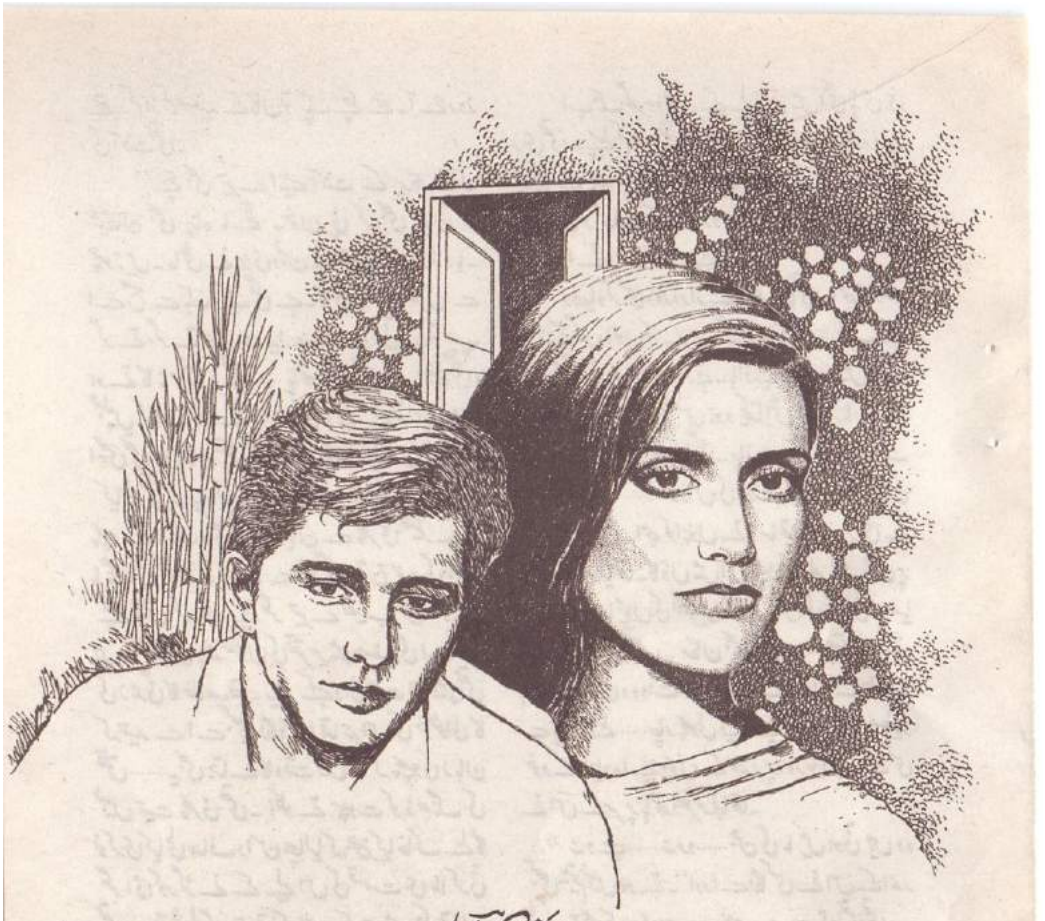

منجدھار

سیما بنت عاصم

صفیہ نے ابھی اپنے فلیٹ میں قدم بھی نہ دھرے تھے کہ جانے کہاں سے اس کی جھلک پا کر امی کی پھٹکار یں نازل ہونی شروع ہوگئیں۔

''آ گئی منحوس، ڈائن، یہ تیرے آنے کا وقت ہے؟ میں پوچھتی ہوں گھر میں تیرا تلوا کیوں نہیں ٹکتا..... میری جان کو یہ چار جونکیں چپکا کے سارے زمانے میں نوکری کے بہانے اڑی، اڑی پھرتی ہے۔ ارے میری بوڑھی ہڈیوں میں اتنا دم ہے کہ تجھے بھی بھگتوں، تیری چار اولادیں بھی سنبھالوں.....؟ موئی نامراد منحوس شکل کی..... گلے میں اٹک گئی تھی، بیاہ کر سانس بھی نہ لی تھی کہ کھوٹے مقدر لے کر پھر میری چھاتی پر مونگ دلنے آن بیٹھی۔''

چوتھی منزل کا زینہ چڑھتے صفیہ کے قدموں میں بار، بار زنجیر پڑی تھی۔ امی کے یہ رونے نئے نہ

www.UrduPalace.com

تھے۔ کم از کم صفیہ کے کان تو پک چکے تھے۔ آئے روز کی آفت تھی۔

"بچے بھی تیرے ایسے آفت کے پرکالے کہ شیطان بھی پناہ مانگے۔ خون پی کر بھی جان نہ چھوڑیں۔ عاطی نے بڑی دلہن کے جہیز کا جگ توڑ دیا۔ اسے صبح سے بک، بک لگی ہے۔ کاشی تیسری منزل سے گرتے، گرتے بچا۔ اور یہ زینت..... روتی ہے تو چپ ہونے کا نام نہیں لیتی..... ہاتھ دکھ گئے، کمر اینٹھ گئی، ہتھلیں کراتے، کراتے..... اری اس سے تو بن بیاہی اچھی تھی کوئی کالی شکل کو سونگھتا نہ تھا تو ایک ہی تو دکھ تھا۔ کیا خبر تھی کہ بیاہ کر یہ دن دیکھنے پڑیں گے۔ اچھی بھلی پھپھو نے مانگ رکھی تھی پر زبان سے پھر گئی ٹھیکرے کی مانگ تھی کم بخت زبان سے پھر گئی۔ آج حمید کی بیوی کیسے عیش کر رہی ہے مگر تیرے نصیب ہی کھوٹے ہیں۔" امی کی چند منٹوں کی تقریر میں صفیہ کی اب تک کی زندگی کا خلاصہ تھا۔ یہ تو کہنے والی بات ہی نہیں تھی کہ حمید سے اسے کبھی لگاؤ رہا تھا نہ اس کی خوشحالی کا قلق..... یہ بھی جتانے کا وقت نہیں تھا کہ پھپھو کی زبان نہیں نیت پھری تھی۔ اکلوتے سپوت کو ڈھنگ کی نوکری کیا ملی صاف دامن بچالیا کہ جہیز کیا خاک ملے گا مگر امی کو رگڑنے کے لیے اس کی قسمت ہی ملا کرتی تھی۔ یہ تو خیر ٹھیک ہی تھا کہ اس کے پیر میں چکر تھا اور کندھوں پر دُہری ذمے داریوں کا بوجھ بچوں کے اسکولز، جاب، گھر داری کے سو بکھیڑے..... آمدنی اکنی، خرچا روپیہ..... اس پر یہ جھک، جھک چخ، چخ آج کل وہ ایک بنگلے میں کھانا پکانے کا کام کرتی تھی۔ دن بھر بچے امی کے پاس رہتے جنہیں خود سو آزار تھے۔ ان کی اپنی حیثیت معزول حکمران کی سی تھی مگر ان کا جھکاؤ بیٹے، بہوؤں کی طرف رہتا تو یہ ان کی ڈپلومیسی تھی۔ انہیں اپنا بڑھاپا محفوظ رکھنا تھا۔ صفیہ بہوؤں کے لیے امی کا بدلا ہوا رویہ دیکھتی تو افسوس دُگنا ہو جاتا۔ اب اس کا کیا بھی کیا جاسکتا تھا کہ اس نے نصیب ہی ٹھنڈے پائے تھے۔

اب تک گھر والوں کے لیے حلق میں انکی ہڈی بنی رہی تھی۔ پہلے کم صورتی کے سبب رشتے کا مسئلہ اور اب بیوگی کے بعد چار بچوں سمیت میکے پر بوجھ۔ کسی نے ٹھیک ہی تو کہا ہے کہ خوشی دو بڑے دکھوں کے درمیان آنے والے وقفے کا نام ہے۔

وہ بیاہ کر کسی دور دراز کے گاؤں گئی تھی۔ امجد کا رشتہ اس کے گھر والوں کو بے سبب نہیں بھایا تھا..... لوگ کہتے اس کے گھر کو ہیرا داماد ملا ہے۔ باادب، لاکھوں میں ایک، نیک فطرت، شریف النفس جو دیکھتا اِش اِش کرتا..... پھر اس ہیرے کو کسی کی نظر کھا گئی۔ چار دن کے بخار میں چٹ پٹ ہو گیا..... اور اس کی موت کے دن ہی کچھ کی کھسر پھسر چلی۔ امجد کو اپنوں نے ڈسا تھا۔ امجد پر کسی نے کالا جادو کرایا تھا۔ گاؤں میں اس کا بڑا سا گھر تھا۔ جس پر سب بہن بھائیوں کی نظریں تھیں۔ اس کی آمدنی بڑھیا تھا، زمینیں بھی تھیں۔ مکان بھی اعلیٰ..... جتنے منہ اتنی باتیں..... یہی وہ وقت تھا جب کچھ بھلے لوگوں نے تاسف سے ہاتھ ملے..... چار پھول جیسے بچے یتیم ہو گئے۔ صفیہ خود سے زیادہ اپنے بچوں کے مقدر پر رو رہی تھی۔ تب کسی نے اس کے سر پر ہاتھ دھر کر کہا تھا۔

"نہ دھیے..... نہ رو..... جن کی مائیں ہوتی ہیں وہ کبھی یتیم نہیں ہوتے۔" اور اسے لگا کسی نے اس کے اندر نئی روح پھونک دی ہو۔ وہ نئے سرے سے جی اٹھی تھی۔

مگر بیٹیاں بد بخت ہوں تو میکا پرایا ہو جاتا ہے۔ قسمت کا کھوٹا پن زندگی کو ناسور بنا دیتا ہے۔ یہ ادراک اسے بیوگی کے بعد میکے آنے کے بعد ہوا۔ جہاں اب اِک، اِک پل بھاری گزرتا تھا۔

ابا نے بھلے وقتوں میں دو کمروں کے دو فلیٹس آمنے سامنے لیے تھے۔ خطا یہ رہی کہ زندگی ہی میں چاروں بیٹوں کے نام کر گئے۔ سامنے والے فلیٹ میں دو بڑے اور اس میں دو چھوٹے رہتے۔ صفیہ اور امی کی تو گنجائش ہی نہیں تھی۔ شاید یوں کہ دلوں میں گنجائش ختم ہو گئی تھی۔ کڑے موسموں میں بھی امی بالکونی میں کھٹولا ڈال کر سوتی تھیں۔ خود وہ بچوں

www.UrduPalace.com

سمیت ہال میں...... یہ چاردیواری اس کی مجبوری تھی۔ یہ لاکھ برے سہی...... اپنے تو تھے۔ مگر اس معاملے میں امی کی ناانصافی الامان الحفیظ......

مانو تنے کو چھوڑ کر پتوں کو پکڑ لیا تھا۔ اور وہی پتے جب ہوا دیتے تب......

بہوئیں شوہروں کی منہ چڑھی تھیں۔ اپنی من پسند زندگی گزارتیں، امی کو گرہستی کے بھی سو اسباب بھگتانے پڑتے تب بھی وہ بری تھیں۔ بہویں، بیٹوں کے کان بھر کر رکھتیں۔ بیویوں کا جادو سر چڑھ کر بولتا تو بیٹے منہ کو آتے۔ امی کو اپنی پناہ گاہ غیر محفوظ پڑ جاتی۔ انہیں اپنا بڑھاپا رُلنے کا خوف ستاتا۔ صفیہ کی حمایت کرتیں تو کہیں کی نہ رہتیں۔ بہوؤں کو بیوہ نند آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی۔ اور بچے...... وہ تو کسی کے ہاتھ ہی نہیں آتے تھے۔ انہیں بوجھ سمجھا گیا۔ دھتکاریں، پھٹکاریں...... بچے کیوں نہ بگڑتے۔ اب وہ منہ کو آنے لگے تھے ...... ممانیاں پیچھا لے لیتیں تو نڈر ہوگئے تھے اب انہیں منہ چڑاتے، چلّاتے، بھاگ جاتے۔ گھر کا ہر برا کام ان ہی کے سر تھوپا جاتا۔ دن بھر کی جھک جھک، چخ چخ اٹھا پٹخ چیخم پکار سو وہ رج کے بگڑ رہے تھے۔ بڑا والا عادی تو سنا تھا لڑکوں میں بیٹھ کر سگریٹ بھی پینے لگا تھا۔ وہ یہاں نہ آتی تو کہاں جاتی۔ گھر سے نہ نکلتی تو پیٹ کا ایندھن کیسے بھرتی؟

مگر کون سمجھتا...... اب تو وہ اِک ننگی تلوار کی طرح سب کے سروں پر لٹکتی تھی۔ یہ ساری بھاگ دوڑ زندگی سے جڑے آزار بھگتانے کی خاطر تھی۔ جو ایسے ہی وقتوں میں رائگاں جاتی نظر آتی۔ دوسرا کتنا ہی اپنا ہو اپنا آپ نہیں بن سکتا۔

اسی چخ، چخ سے اس نے بار ہا چاہا اپنا ٹھکانا کہیں اور کر لے مگر یہ اتنا آسان نہیں تھا۔ وہ خود جوان جہان تھی، چار بچوں کو لے کر کہاں رُلتی پھرتی۔ تنہا عورت پر سارے زمانے کی نظر ہوتی ہے۔ گاؤں میں اس کا اپنا مکان تھا۔ جو اجڑ گیا تھا۔ اس اجڑے گھر کو بسانے کے لیے اس کا گاؤدی جیٹھ اس پر جال ڈالتا اس کی نظریں بدلنے لگی تھیں۔ تب اس نے اتنے مرلوں کے مکان پر تھوک دیا تھا۔

وہ ایک منٹ بھی خود کے لیے سوچتی تو دنیا اس کے لیے تنگ نہیں تھی۔ وہ جوان تھی مزے سے پیر پھیلا کے سوتی۔ شاید کوئی اس کے صدقے اس کے بچوں کو بھی منظور کر لیتا مگر بچوں کا کہیں گزارہ نہیں تھا۔ یہ وہ جانتی تھی خود اپنی خواہشات تو کسی کونے میں جا سوئی تھیں۔ اور یہیں آ کر ہر بات ختم ہو جاتی تھی کہ اس نے اپنی زندگی بچوں کے لیے وقف کر دی تھی۔

کبھی کبھی زندگی حلق میں اٹکی ہڈی بھی تو بن جاتی ہے۔

☆☆☆

صفیہ کا انتشار بڑھتا تو اگلا قدم ماہین کے گھر پڑتا۔ جہاں ہر بار پرانی کہانی چلتی۔ آج بھی وہ اٹوائی کھٹوائی لیے پڑی تھیں۔ ان کی امی کی پھٹکاریں جاری تھیں۔ مگر وہاں اِک بے نیازی تھی۔ رخ موڑے چادر سے کان لپیٹ رکھے تھے۔

''ارے تم ہی سمجھاؤ اسے۔ جیسے آنا فانا باپ گزر گئے۔ اگر میری بھی آ گئی تو کس کی ماں کو ماں کہے گی۔ ڈگریاں، اعلیٰ عہدہ سب کا سب دھرا رہ جاتا ہے۔ عورت کتنی بھی پڑھ لکھ جائے...... رہتی تو عورت ہی ہے ناں...... کون پوچھے گا جو بے آسرا ہو گئی تو...... اِک بھائی خود کے قابل نہیں، اسے کیا بیاہے گا؟''

صفیہ تو کیا خود ماہین بھی ان تلخ حقائق سے بے بہرہ نہ تھی۔ مگر یہ دلوں پر پھیلی کہانی تھی۔ ماہین محبت کی ڈسی ہوئی تھی، اورنگ زیب نے شادی کرتے سمے بہت سارے وعدے اس کے پلو سے باندھے تھے مگر وہ شادی شدہ بال بچے دار تھا۔ امی کو ردو کد تھی۔

مگر ماہین کی عمر نکل رہی تھی۔ وہ مجبور ہو گئیں کہ بیٹی کا جھکاؤ تھا۔ بیٹی تعلیم یافتہ اور پھر کماؤ ہو تو ماننے ہی بن پڑتی ہے۔ انہوں نے بلامقابلہ ہار مان لی۔ اورنگ زیب نے شادی پوشیدہ رکھی تھی۔ رضیہ ان کی

www.UrduPalace.com

خاندانی بیوی تھی۔ اورنگ زیب کی بہن وٹے میں بیاہی گئی تھی۔ ان کی شادی کا بھانڈا پھوٹا تو چڑھائی کردی۔ جوان اولاد منہ کو آگئی، اورنگ زیب کو ہتھیار ڈالنے پڑے اور ماہین بے نام ہوگئی مگر پھر تقدیر اور دنیا کے ہر مرد سے اس کا بھروسا اٹھ گیا تھا۔ ہوا تو کچھ بھی نہیں تھا بس کچھ خواب ٹوٹے تھے جن کی کرچیاں اب بھی ماہین کی آنکھوں میں چبھتی تھیں۔ وہ دنیا کو شفاف نظروں سے دیکھ ہی نہیں پا رہی تھی۔ وہ سمجھانے بیٹھ بھی جاتی تو ماہین کہتی یہ سب دل کے معاملے ہیں جب دل خالی ہو جائے تو انسان صفر ہو جاتا ہے۔

مگر یہ دماغ کی نہیں دل کی خرابی تھی..... صفیہ کو ماہین رستے میں ملتی تھیں۔ وہ مین روڈ تک جانے کے لیے چنگ چی کے انتظار میں کھڑی ہوتی۔ جب وہ سرخ کار اعتماد سے ڈرائیو کرتی گزرتی پھر وہ اسے دیکھ کر رکنے لگیں۔ صاف شفاف نکھری ستھری نک سک سے تیار..... صفیہ انہیں دیکھ، دیکھ کر رشک کرتی تھی۔

صفیہ کا مطلوبہ گھر اس وقت اس کے رستے میں پڑتا تھا۔ وہ اکثر اسے اتار دیتی پھر ان چند گھڑیوں کی رفاقت میں ان دونوں نے ایک دوسرے پر اپنے آزار کھولے تھے۔ ان ہی لمحات میں اس نے بارہا صفیہ کو مشوروں سے نوازا تھا۔

"صفیہ! تم شادی کرلو، ابھی تم کم عمر ہو، بچے چھوٹے ہیں۔" اور اس کا جواب ایک ہی رہتا۔

"مجھے تو شوہر مل جائے گا..... مگر بچوں کو باپ نہیں مل سکتا۔" مانو وہ لاجواب ہو جاتی۔ اس کی شخصیت میں ٹھہراؤ تھا۔ صفیہ کو وہ کسی بڑے گھرانے کی فرد لگتی تھی۔ ایسے وقتوں میں قلق ستاتا۔ کاش چار حروف پڑھے ہوتے۔ قلم چلانے کا ہنر آتا تو جسم کڑی مشقت سے ٹوٹتا نہ..... اتنی تنگی کا منہ دیکھنا پڑتا..... یہ اور بات کہ اس نفسا نفسی کا عالم تب بھی وہی رہتا۔ اپنے عذاب دوسروں کے سر ڈال دینے سے عذاب دُگنے پڑ جاتے ہیں۔

مگر یہ نصیب کی بات تھی جس کے لیے کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ماہین کہتی زندگی کے سکھ پر سب کا حق ہے مگر ہر کوئی قسمت کا لکھا بھگتتا ہے۔ اسے ادراک تھا روڈ پر چلنے اور کاروں میں گھومنے والوں کے ماہین قسمت کا ہی تو فرق ہے۔

بعد ازاں معلوم ہوا یہ ساری بڈھے باس کی عنایات ہیں۔ باس کی نظروں میں کھوٹ ہے۔ وہ انہیں اپنے اشاروں پر نچانا چاہتا ہے۔ ماہین کسی اور جاب کی تلاش میں ہیں۔ وہ گھر کو سپورٹ کرتی ہیں، ان کی شاندار زندگی بس اِک دکھاوا ہے۔

وہ آج ان کے بے حد اصرار پر ڈھونڈتی ڈھانڈتی ان کے گھر تک پہنچی تھی۔ وہ کچن میں کھڑی تھیں۔ سر جھاڑ منہ پھاڑ..... اسے یقین کرنا دشوار ہو گیا یہ ماہین ہیں۔ جن کے لباس پر شکن تک نہیں ہوتی تھی۔ اور وہ جو اس کا گمان تھا کہ ماہین کی شخصیت میں ٹھہراؤ ہے۔ خاک میں مل گیا۔ وہ آج بکھری ہوئی تھیں، ان پر آج بھی امی کی پھٹکاریں برس رہی تھیں۔ وہ نادم ہو گئیں۔

"یہی تو المیہ ہے ہمارے معاشرے کا..... لڑکیوں کو ان کی ٹریجڈیز جتا جتا کر کامپلیکس کا شکار کر دیتے ہیں۔ وہ دنیا کے لیے خود کو ناقابلِ قبول سمجھنے لگتی ہیں۔" اسے کہنا پڑا۔

"احمق ہو..... نصیب سے بھی کوئی جیت سکا ہے بھلا۔"

"ارے نصیب تو نے پڑھ رکھے ہیں کیا؟ اِدھر انہوں نے کہا..... اُدھر امی کا لقمہ.....

"ارے ہمارے باپ بھائی مرد نہیں ہوتے کیا۔ صفیہ.....! تم ہی اسے سمجھاؤ۔ ایسا سب سوچیں تو کسی کا گھر نہ بسے۔"

صفیہ جانتی تھی ماہین کی اپنی ماں سے کم ہی بنتی ہے۔

"گھر مقدر سے بستے ہیں اماں..... جو کھوٹے مقدر لے کر پیدا ہوتے ہیں وہ سدا در بدر رہتے ہیں۔ انہیں کہیں خوشی نہیں ملتی۔" وہ بھڑک کر اٹھی تھیں۔

ماہین کا جملہ صفیہ کے دل کو ٹھاہ کر کے لگا..... سچ تو ہے کہ کسی کو گھر سے نکلتے ہی مل جاتی ہے منزل اور کوئی عمر بھر کا مسافر..... اماں وہاں سے سرکیں تو اس نے کہا۔

"دکھوں کے بعد کہیں نہ کہیں کسی خوشی کا در بھی

www.UrduPalace.com

ضرور کھلتا ہے۔''

''مان لو کہ کچھ لوگ دنیا میں صرف دکھ اٹھانے کے لیے آئے ہیں۔'' انہوں نے مایوسی سے سر ہلایا تھا۔

''تو پھر مجھے کیوں شادی کا مشورہ دیا جاتا ہے؟''

''زندگی کسی کے لیے رکتی ہے نہ ختم ہوتی ہے۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے؟''

''کوئی اس جیسا ملے بھی تو.....'' اس کے اندر کسی یاد نے چٹکی لی۔ ''یہ ناممکن ہے، آپ میرے بیٹے عادی کو نہیں جانتیں۔ وہ سیانا ہو رہا ہے۔ ایسے کسی ذکر پر بھی کونوں میں چھپ، چھپ کر روتا ہے۔ اور زینت!'' اس نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ''اس دور میں فرشتے کہاں ملتے ہیں؟''

''اللہ کی آزمائش کو خود کے لیے خوش بختی سمجھو، یاد رکھو کہ تم قدم قدم پر نیکی کما رہی ہو..... اللہ آزمائش کے لیے اپنے خاص بندوں کو چنتا ہے۔ تمہارا صبر سب سے بڑھ کر ضبطِ نفس..... جو جہاد سے بھی افضل ہے۔''

''جب رب پر اتنا بھروسا ہے تو پھر تقدیر کا شکوہ بھی نہ کیا کریں۔''

''تمہاری بات اور ہے..... شاید مجھے پروردگار نے کچھ اور کاموں کے لیے وقف کیا ہے۔''

ماہین ان لوگوں میں سے تھیں۔ جن کی زندگی میں ان کا اپنا کچھ نہیں ہوتا جوان کڑیل بھائی تھا مگر بے فکری میں زندگی گزاری۔ نہ ماں کی پروا پالی نہ جوان بہن کی فکر کی۔ اب تک جو کیا سو کیا..... باپ کے گزرنے پر بھی گھر کو گھر سمجھا نہ ماں کو ماں..... اپنی مستی میں مست رہے۔ نکما، نشے باز، شادی کیسے ہوتی اور کہاں سے ہوتی۔ اماں اس کی شادی کے نام پر بھی کانوں کو ہاتھ لگاتیں۔ اور زمانہ ایسے لوگوں پر نظر رکھتا ہے۔ اسے بھی اپنے جیسی عورت ہاتھ لگی۔ مقدر پھوڑ لیے، بری بھلی جو گلے پڑی پھنس گیا نتیجتاً آج گھر کا تھانہ گھاٹ کا۔ دو بار لات کھائی اور لوٹ کے بدھو گھر کو آئے۔

ماہین کی اس سے پل بھر نہ بنتی..... اس کے نوالے کھٹکتے مگر وہ یہاں نہ پڑتا تو کہاں جاتا..... ماں کا جھکاؤ

غزل

خیالوں میں ترے رہنا بڑا مہنگا پڑا ہے
تری الفت کا یہ گہنا بڑا مہنگا پڑا ہے
مری آہوں میں بدلیں ساری خوشیاں
یوں آنسو کی طرح بہنا بڑا مہنگا پڑا ہے
ترے وعدوں نے مجھ کو تو دیوانہ کر دیا ہے
لباسِ عشق جو پہنا بڑا مہنگا پڑا ہے
بہاروں کی رہی ہوں منتظر، کس کو بتاؤں
غموں کی دھوپ کو سہنا بڑا مہنگا پڑا ہے
مری فریاد اب خانم سنے گا میرا مولا
کسی سے حالِ دل کہنا بڑا مہنگا پڑا ہے

شاعرہ: فریدہ خانم، لاہور

بیٹے کی طرف رہتا..... ایسے بیٹے بھی ماؤں کو بڑھاپے کا سہارا لگتے ہیں۔ ماہین کا کیا ہے بیاہی گئی تو.....

ایسے میں وہ بھول جاتیں کہ ماہین کی شادی کے بعد کچھ دن بھی ان کے لیے پہاڑ بن گئے تھے۔ اس نے سارے گھر کو سمیٹ رکھا تھا۔ بھائی اپنے قابل نہیں تھا۔ ماں کو خاک سنبھالتا۔ بات بات پر منہ کو آتا۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے کہا گیا ہے کہ کچھ دکھ قسمت میں درج ہوتے ہیں۔ کچھ انسان خود اپنے ہاتھوں سے خریدتا ہے۔ اس گھر میں ماہین نہ ہوتی تو گھر کا شیرازہ بکھر جاتا۔ مگر مانتا کون تھا۔

اس کی نوکری اب رسک پر لگی تھی۔ بڈھا اس پر جال پھینکتا وہ دامن بچاتی اب وہ خار کھائے بیٹھا تھا۔ وگرنہ اس سے بات کا ہی نہیں ہاتھ کا بھی سہارا تھا۔ بِنا کہے اس کی ہر ضرورت کو جانچ جاتی بچوں سے اس کے چاؤ چونچلے چلتے..... بہانے بہانے سے نوازتی رہی تھی۔ صفیہ بچوں سے ان کا بچپن چھیننا نہیں چاہتی تھی۔ دستِ نگر ہو کر جینے کا احساس انسان کو پورے قد

www.UrduPalace.com

سے کھڑا نہیں ہونے دیتا مگر ماہین کے نوازنے کا انداز بڑا استحقاق، اپنائیت لیے ہوئے ہوتا۔

''خبردار تم خاموش رہو، یہ خالہ بھانجوں کا معاملہ ہے۔''

یہیں آکر اس کا رنج دُگنا پڑ جاتا تھا۔ دنیا اس کے بچوں کو یتیم سمجھ کر سر پر ہاتھ تو دھر دیتی تھی۔ گھر والے تو فطرہ زکوٰۃ بھی دوسروں کے لیے نکالتے، امی کی پنشن آتی تھی چار بھائی ہزار روپیہ بھی مہینہ نکالتے تو وہ کاہے کو در بدر پھرتی۔ مگر کون سمجھتا تھا شاید اسی غیریت کا انعام تھا۔ اِک بھائی بے اولاد، دوسرے پر طلاق کا ٹھپا تھا۔ نا انصافی کیسی بھی ہو انسان کے سامنے آکر کھڑی ہو جاتی ہے۔ انسان نہ سمجھے وہ اور بات ہے مگر وہ ماں کے نہ رہے تو صفیہ تو پھر صفیہ تھی۔

ماہین نے کچن کا رخ کرنا چاہا تو صفیہ نے اس کے ارادے بھانپ کر ہاتھ تھام لیے۔

''میرے لیے کچھ نہ کریں عاطی کو کل رات سے بخار ہے۔ اس کو روتا چھوڑ کر آئی ہوں۔''

''کیوں روتا چھوڑ کر آئی ہو؟'' ان کا لہجہ شاکی ہو گیا۔ ''تم سے ہزار بار کہا ہے کہ بچوں کے دل کو نہ مارا کرو..... اور زینت کو بھی نہیں لائی ناں تم.....'' وہ اس سے پیار بھرے شکوے کر رہی تھیں اور ساتھ، ساتھ اس کے کھانے کے لیے اہتمام اور واپسی پر بچوں کے لیے بھی بہت کچھ باندھ کر دیا۔

صفیہ نہیں چاہتی تھی اپنے چار بچوں سے ان کا بچپن چھینے سو اپنا آپ... پٹتی پھرتی۔ اسے بار ہا یہی جملہ کانوں میں گونجتا۔

''جن کی مائیں ہوتی ہیں وہ کبھی یتیم نہیں ہوتے۔''

وہ دل ہی دل میں اسی جملے کو دُہراتی رہتی مگر بچے پھر بچے ہوتے ہیں۔ کبھی انہیں بہلانا مشکل پڑ جاتا ہے۔

عید کے لیے ابھی سے فرمائشیں گنوادی تھیں۔ عادی کی پکنک کی فرمائش تھی۔ اب پکنک کوئی سستی پڑتی ہے۔ ہزار کا پتا صاف ہو جاتا ہے۔ گھر والے اکثر آؤٹنگ پر جاتے مگر وہ ان لوگوں کے ساتھ جاتے تو واپسی پر بھاجوں کے منہ پھولے نظر آتے۔

شکایتوں کے دفتر کھلے ملتے۔ بچوں کو آؤٹنگ پر لے کر گئے تو عاطی نے دکان سے چپس کا پیکٹ اڑا لیا۔ بے عزت وہ ہوئے کاشی کو جھولے کا ٹکٹ دلایا تو چپکے سے بیچ کر دام کھرے کر لیے۔ عاطی، کاشی کی ایک پل نہ بنتی۔ ہر معاملے میں چھین جھپٹ چلتی..... بریانی کی پلیٹ دونوں کو الگ درکار تھی۔ گفٹ شاپ لے کر گئے تو عاطی نے دکان سر پر اٹھالی۔ اسے مہنگی چیز درکار تھی۔ بس ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ ایسے میں اسے لگتا کہ اب تک کی مسافت لاحاصل رہی ہے۔

اس نے لاکھ بہلاوے دے کر بچوں کو ان کے ساتھ جانے سے روک دیا تھا۔ شاید انہیں یہی درکار تھا۔ اب بھاوجیں بن ٹھن کے اور ان کے بچے نیچے اتراتے ہوئے جاتے، اس کے بچے منہ تاکتے۔ مگر یہ بھی تھا کہ ایک نہ دو چار بچوں کو اس مہنگائی میں خود سے ہم پلہ رکھنا دشوار تھا۔ بچے اس سے کہتے اور وہ کس سے کہتی؟

اس کے آزار ایسے نادیدہ نہ تھے۔ مگر سب کے دلوں پر جیسے مہر لگ گئی تھی۔

شاید وہ اتنی بری نہ ہوتی اگر ماں کی طرح ڈپلومیٹ ہوتی۔ اور یہی نکتہ سارے فساد کی جڑ تھا۔ امی بہوؤں کے صدقے واری جاتیں اور صفیہ کی بیری تھیں تو یہ اس کی قسمت تھی۔ جس پر کس کا بس چلتا ہے۔ اتنا تو وہ بھی جانتی تھی۔ امی دل کی بری نہیں تھیں۔ بس بیک وقت کئی کشتیوں کی سوار تھیں۔ جو رب کی ذات سے توکل کھو دیتے ہیں۔ وہ یونہی دوسروں میں سہارے تلاشتے ہیں۔

☆☆☆

کلفٹن کے گزوں پھیلے بنگلوں کے درمیان وہ اترن کی چادر لہراتی جا رہی تھی۔ جب کوئی ایک بار پھر دامن گیر ہوا۔

''اے لڑکی! کہاں گم تھیں۔ میں راستہ تکتا رہا۔''

پینتیس سال کی عمر میں کوئی اسے لڑکی سمجھتا تو یہ اس کی خوش بختی ہی کہلائی جا سکتی تھی۔ اب اس میں اس کا کیا قصور کہ وہ چار بچوں کی ماں ہو کر بھی تو لڑکی سی لگتی تھی۔

www.UrduPalace.com

''تم سے کتنی بار کہا ہے کہ میرے پیچھے نہ آیا کرو۔''

''میں نے بھی کتنی بار بتایا ہے کہ تم مجھے اچھی لگتی ہو۔''

''اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اچھی ہوں بھی۔''

یہ محض تغافل تھا ورنہ جانتی تھی کہ وہ کتنی دلکش تھی..... اس کی شکل اتنی کالی بھی نہیں تھی جتنی امی رگڑتی تھیں۔

اور یہ بات اسے دنیا نے ہی بتائی تھی کہ وہ قابلِ قبول ہے۔

''ہائے کوئی میرے دل سے پوچھے۔'' اس نے سینے پر ہاتھ دھرا اور صفیہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔

''کان کھول کر سن لو..... یہ میں آخری بار کہہ رہی ہوں۔ اب اگر میرے پیچھے آئے تو اچھا نہ ہوگا۔'' یہ صرف دھمکی تھی ورنہ اس نے بھلا کیا بگاڑ لینا تھا۔ زیادہ سے زیادہ نوکری چھوڑ دیتی جس میں اپنا ہی نقصان تھا۔ وہ مڑ گیا اس کے تیور ہی اتنے خطرناک تھے۔ ایسے جانے کتنے اس نے موڑے تھے۔ اس سے بڑھ کر کون جانتا تھا کہ دنیا، دوسروں کی مجبوریوں کو کیش کرتی ہے مگر رستوں کی کٹھنائیوں کا دکھ صرف وہی جانتے ہیں جو خود یہ کٹھنائیاں اٹھاتے ہیں۔

یہ ماہین کا ہی مشورہ تھا کہ چھوٹے چھوٹے کئی گھروں میں نوکری کرنے سے بہتر ہے کسی اعلیٰ اور پوش علاقے میں نوکری کرو۔ چار گھر کے برابر اجرت اور اترن، استعمال کی چیزیں یہ، وہ پھر اس مد میں ماہین کی کوششیں ہی رنگ لائی تھیں۔ بڑے لوگوں سے ان کے مراسم تھے۔ مگر بڑے لوگوں کے مزاج الامان الحفیظ۔

وہ جس بنگلے پر کام کرتی وہاں کئی نوکر تھے۔ پیسے کی بھی بہتات تھی۔ اسراف بلا کا تھا۔ الوداع پر روزہ کھلوایا۔ خیرات بانٹی۔

''اس خیرات پر پہلا حق ہمارا ہے۔'' گھر کی ماسی چھمو نے کہا۔

''تمہیں ہر ماہ بھی... خیرات ملتی تو ہے جو تمہاری اوقات سے بڑھ کر ہے.....'' تب رعونت سے جواب ملا.....

وہ اجرت کو خیرات کہہ رہے تھے۔ کون نہ تلملاتا، چھمو نے بھی منہ چلایا۔ اور لیجیے جناب ہوگئی چھٹی.....

شاید ایسے ہی وقتوں کے لیے کسی دانشور نے کہا ہے کہ زبان میں ہڈی نہیں ہوتی لیکن یہ آپ کی کھوپڑی تڑوا سکتی ہے۔ یہاں کھوپڑی تو بچ گئی مگر روٹیوں کے لالے پڑ گئے۔ چھمو بھی چھوٹے، چھوٹے بچوں کی ماں تھی۔ یہ وہ جانتی تھی مگر نا انصافی سی نا انصافی تھی۔ بات وہی تھی اپنے مقدر کی سیاہی خود ہی بھگتنی پڑتی ہے۔ صفیہ ہر ماہ امی کو پندرہ سو دیتی تھی۔ اس بار امی نے لوٹا دیے۔ مانو صاف اشارہ تھا کہ اپنا چولھا چوکی الگ کرو۔ ایسے وقتوں میں اس کی نظروں کے سامنے وہ لمحات گھومتے جن میں وہ امی کے سامنے آ لگتی تھی۔ ہرے برے وقت میں سب سے پہلے کھڑی ہوتی ورنہ یہ بہویں انہیں بیچ کھاتیں اور یہی نکتہ فساد کی جڑ تھا۔ جس کے سبب وہ بدزبان امی غاصب تھیں۔ مگر وقت برا تھا جس میں سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔ یہ تو پھر امی تھیں۔ جن پر ایک نہ دو، تین بہوؤں کا دباؤ تھا۔ ان کے خیال میں پندرہ سو کے عوض دن بھر کی چاکری مہنگی تھی۔ اب اِک نیا دردِ سر اس کی جان کو پڑ گیا۔ بچے بھوک سے بلبلاتے تو فون پر فون کھڑکاتے۔ وہ نشتم پشتم بھاگتی کبھی کچھ لیتی آتی۔ کبھی بچا کھچا ملتا..... مگر اس میں چار بچ جاتے۔ وہ گھر سے باہر لقمہ اٹھاتی تو نوالے اٹکتے، بچا کھچا جو ملتا ساتھ باندھ کر لاتی۔ بچے بھوکے ہوتے ٹوٹ پڑتے ندیدوں کے طرح..... دنیا کسی حال میں خوش نہیں رہتی، وہ تینوں چٹخارے لیتی تھیں۔ بچوں سے ان کی بدتمیزیوں کے سبب خار کھانے لگی تھیں، یہ تو ٹھیک ہی تھا بچے بگڑ رہے تھے۔ اسکول سے بھی شکایتیں آتیں، صفیہ زیادہ بھاؤ کھاتی تو عادی، کاشی، عاطی کے ہاتھ جلا دیتی۔ زینت کو دھنک کر رکھ دیتی۔ بعد میں خود بھی پھوٹ، پھوٹ کر روتی۔ ایک اس کے بیوہ ہو جانے سے جیسے سارا زمانہ پرایا ہو گیا تھا۔ نہ پیروں تلے زمین اپنی تھی نہ سر پر آسمان..... سچ تو یہ تھا کہ وہ تھکنے لگی تھی۔ کبھی کبھی دل چاہتا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں دور چلی جائے..... مگر یہ اتنا آسان کب رہا تھا کہ پیروں کی زنجیریں چھنک اٹھیں۔

www.UrduPalace.com

اپنی زندگی تو جیسے امجد کے ساتھ قبر میں جا سوئی تھی۔ جو کہتا تھا تو میری زندگی ہے، سچ مر جاؤں گا تیرے بغیر.....

اس وقت وہ خود کو واقعی مقدر کی دھنی سمجھتی تھی۔

☆☆☆

عاطی کا بخار زور پکڑتا چلا گیا۔ اس نے دن رات ایک کر دیے۔ گرما کی طویل راتوں میں تنہا اسپتال کے کاریڈور میں ایک ٹانگ پر کھڑی رہی۔ ڈاکٹروں کی پرچیاں لے کر یہاں وہاں ناچتی پھری۔ تب کہیں جا کے عاطی نے آنکھیں پٹپٹائیں۔

اسپتال سے رخصت نصیب ہوئی مگر نوکری سے جواب مل گیا۔ اگرچہ وہ بار، بار فون گھما کے عاطی کی حالت کی اطلاع دیتی رہی تھی۔ مگر بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ان کے کام پڑے رہ گئے تھے۔ کسی کو تو کرنے تھے ناں..... نوکروں کی کمی نہیں ہے۔

ماہین نے سنا تو سر پیٹ لیا۔ پتا تھا اس کے گھر کا چولھا بجھ جائے گا۔ اگرچہ ان کے اپنے گھر کا چولھا بجھنے کو تھا۔ ان کا بڈھا باس انہیں اپنی محبت کا جھانسا دیتا رہا تھا۔ بار، بار کی ناکامی پر بالآخر خلاصی کا پرچا ان کے ہاتھ آ گیا۔ یہ محبت کی نہیں شرافت کی اصلیت تھی مگر ماہین کا صبر و شکر اور توکل کیا کہنے.....

''رب مجھے بہت نوازے گا مگر باس نے زیادتی کا گناہ اپنے نامۂ اعمال میں لکھوالیا ہے۔'' اور اس وقت صفیہ کے لیے اپنی روٹیوں کے لالے تھے کیا کہتی..... انہوں نے کچھ سوچا پھر چپکے سے کھٹا کھٹ کاغذ پر ایک ایڈریس گھسیٹ دیا۔

اتنا تو وہ بھی جانتی تھی قدرے ایک پوش ایریا میں ماہین کی اک بیاہی بہن رہتی تھی جس کے نام پر بھی ماہین کی امی کہتیں۔ میں مر بھی جاؤں تو سمیرا کو نہ بلانا۔

''سمیرا کی بیک یون میں پرابلم ہے، اسے ایک میڈ چاہیے فی الحال کام چلاؤ پھر آگے دیکھتے ہیں۔'' وہ وہاں اگلے دن ہی چلی گئی۔

اسے سمیرا بڑی اچھی سی لگی۔ مگر بعد ازاں معلوم ہوا اس کا حسن ظاہری ہے۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی جنہیں دنیا جہنمی کہتی ہے۔ مگر وہ دنیا کو دوسروں کے لیے جہنم بنا کے رکھتی تھی۔ سمیرا نے اپنے گھر کو بازار بنا رکھا تھا۔ ہر آئے گئے کے لیے دروازہ کھلا رہتا۔ ہر وقت اس کے کانوں سے موبائل لگا رہتا۔ سگریٹ پیتی، موبائل پر اونچے اونچے قہقہے لگاتی۔ کبھی ایک ہی کال پر ہڑبڑا کر دوڑتی۔ کبھی اس کے گھر تالا جھولتا گھر میں دھول اڑتی رہتی۔ بچے رُلتے پھرتے۔ وہ خود گھر سے غائب رہتی۔ مگر سمیرا کے لیے ماہین کے گھر کے دروازے بند تھے۔ اس کی امی کہتیں ہمارے لیے سمیرا مر گئی۔

انہیں ماہین کے مستقبل کا خوف ستاتا..... اِک بدکردار عورت کی بہن کو دنیا کیسے قبول کرے گی۔ بھائی نکما سہی بے غیرت نہ تھا تن کر کھڑا ہو جاتا..... سمیرا کے کالے کرتوتوں کے سبب منہ چھپائے پھرتا..... چار لوگوں میں بیٹھنے سے ڈرتا..... دنیا تھلم کھلا تھوکتی ہے۔ انسان کس کس سے لڑے۔ جبکہ سکہ بھی خود اپنا ہی کھوٹا ہو۔ بھائی سمیرا کی شکل تک دیکھنے کا روادار نہیں تھا۔ بچے لوٹ پھیر کر نانی کے گھر کا راستہ دیکھتے۔ جہاں ماہین جیسی سمیٹنے والی ہستی جو تھی۔ ماں جیسی ماسی وہ ان کی خاطر سب سے لڑ بھی لیتی۔ کئی بار صفیہ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

سمیرا بچوں کو لے کر دروازے سے لوٹ گئی۔ اور یہ بھی کہ ماہین کی امی چھپ، چھپ کر روئیں وہ سمیرا سے ربط رکھتیں تو اس کی شہرت داغ دار تھی۔ پھر بیٹے سے جاتیں کبھی جو کوئی بھولے بھٹکے انہیں سمجھانے بیٹھ جاتا۔ وہ ہتھے سے اکھڑ جاتیں۔

''وہ ہمارے لیے مر گئی۔ آج کہا آئندہ نہ کہنا۔'' مانو دکھتا رستا ناسور کاٹ کر پھینک دیا تھا۔

حیرت تو اسے سمیرا کے شوہر عدیل پر ہوتی۔ ایسا مرد جو بیوی کے ہاتھوں کھلونا بنا ہوا تھا۔ دو ٹکے کی اوقات تھی۔ اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی سمیرا کو خار چڑھتی۔ منٹوں میں عزت اتار کر رکھ دیتی۔ کیا مجال جو وہ لب کھول لے۔

www.UrduPalace.com

''میں تو ہوں ہی بری..... وہ رہا دروازہ اٹھا اپنا بوریا بستر.....اور راستہ ناپ۔''

جانتی جو تھی، اس کا پچھلا کھوکھلا ہے۔ عدیل کو بھی اپنا وہ وقت یاد تھا۔ جب اس نے سچ مچ غیرت میں آکر گھر چھوڑ دیا اور پھر رُلتا پھرا تھا۔ اپنے گھر پر بھی دو بھائی قابض تھے۔ بہنیں بیاہی گئیں۔ سمیرا اپنے کالے کرتوتوں کے سبب وہاں سے نکلی تھی۔

اب مکان کے دروازے پر نظر تھی۔ مگر حصہ دیتی تھی ان کی جوتی۔ عدیل کی کمزوری سے سمیرا کو شہ ملی تھی۔ وہ اپنی من مانی کرنے کی عادی ہوگئی تھی۔

میاں کی تنخواہ محدود مگر گھر میں پیسے کی ریل پیل تھی۔ عدیل نے گھر کی ڈپلی کیٹ چابی بنوا رکھی تھی۔ تاکہ گھر لوٹے تو تالا کھول کر اندر بیٹھ جائے۔ بھوک ستاتی تو بچوں کو لے کر یہاں وہاں کھانا کھانے نکل جاتا۔ سمیرا کا انتظار فضول تھا۔ ایسے میں سمیرا کا موبائل بند ہوتا۔ سمیرا لوٹتی تو ہوٹل کا کھانا لٹکاتی آتی۔ گھر میں ہوتی تو عدیل کی پیٹھ مڑتے ہی گھر میں آمد و رفت شروع ہوجاتی۔ اگرچہ موجودگی میں بھی اس نے کیا بگاڑ لینا تھا۔ مانو اک خاموش سمجھوتا.....

صفیہ کو حیرت ہوتی۔ عدیل اِک مکمل انسان تھا بلکہ نادر و نایاب عزت، شرافت سبھی کچھ تو تھا۔ مگر وہ سمیرا کے دل کو چڑھا ہی نہیں۔ جو فطرتاً سرکش تھی۔ نئے جہانوں کی تلاش میں رہتی۔ یہی نکتہ ساری خرابی کی جڑ تھا۔ اور ایسے ہی معاملات کے لیے ماہین نے بھلے وقتوں میں کہا تھا کہ یہ سارے دل کے فیصلے ہوتے ہیں۔ جب دل خالی ہوجائے تو انسان صفر ہوجاتا ہے۔ وہی معاملہ تھا مگر دلوں میں جھانک کر دیکھتا کون ہے؟ بس اس نے مارے باندھے وہاں کچھ دن نمٹائے تھے ہوا تو کچھ نہیں تھا۔ بس چھوٹی سی بات پڑھ کر گمبھیر صورت اختیار کرگئی تھی۔

رمضان المبارک کی آمد کے ساتھ رحمتوں بھرے عشرے میں اس کے روزگار کی سبیل بن گئی تھی۔ مگر ٹائمنگز افطار کے بعد ڈنر تک پر چلتیں اسے افطار کے ساتھ ڈنر تک کا انتظام کر کے لوٹنا ہوتا.....نئی، نئی نوکری تھی وہ ہر پل محتاط رہتی، خاموش پالیسی.....

دوسرا عشرہ چل رہا تھا، امی کا فون اس کے پاس افطار سے کچھ دیر قبل آیا تھا۔ عاطی نے عادی کو سیڑھیوں سے دھکا دے دیا تھا۔

صفیہ کے ہاتھ پیر پھول گئے تھے۔ روزہ اسٹاپ پر افطار ہوا مگر اس کے حلق سے ایک کھجور بھی ڈھنگ سے نہ اتر سکی۔ وہ ہانپتی کانپتی گھر سے قریبی کلینک پر پہنچی تھی۔ عادی کو چار ٹانکے آئے تھے۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ عادی، عاطی نے مل کر کسی کا موبائل اڑایا تھا۔ چھین جھپٹ میں عاطی نے غصے سے عادی کو دھکا دے دیا۔ مگر اس بار چاروں بھائی تن کر کھڑے ہوگئے۔ خود انہوں نے جو کیا سو کیا مگر ان کا گھر بدنام و ذلت صفیہ کے بچوں سے ہوتی تھی۔ صفیہ نے اسی رات اپنا سامان باندھ لیا تھا۔ اللہ کی زمین بہت بڑی ہے۔

اور یہ شاید پہلی بار تھا کہ امی اس کے لیے کھڑی ہوئی تھیں۔ وہ صفیہ کے ساتھ جائیں گی۔ وہ جوان جہان بچوں کے ساتھ اکیلی رُلتی پھرے گی۔ مگر وہ اور تن گئے۔

ان کی بیویوں کو امی سے سو سکھ تھے بھلے دو ٹکے کی اوقات کر رکھی تھی مگر بیٹی کے ساتھ رہ پڑنے میں دنیا انہیں تھوکتی۔ بڑے نے صاف کہہ دیا اگر وہ صفیہ کے ساتھ گئیں تو صفیہ کے ساتھ ساتھ ان کے لیے بھی اس گھر کے دروازے بند.....

اسی بات پر امی کی گٹھریوں کا منہ کھل گیا تھا۔ قسمت نے انہیں کئی کشتیوں کا سوار بنا رکھا تھا۔ وہ ایک پر قدم رکھتیں تو دوسری ڈول جاتی یہیں آکر اماں مار کھا جاتیں۔

کبھی کسی نے کہا تھا کہ جن کی مائیں ہوتی ہیں وہ کبھی یتیم نہیں ہوتے۔

مگر جن کی بیٹیاں بدبخت ہوتی ہیں وہ مائیں.....؟ شاید یونہی ڈولتی کشتیوں کی سوار ہوتی ہیں۔

www.UrduPalace.com